۷

مرزا مقبول بیگ بدخشانی

ایران کے تمدّنِ قدیم پر ایک نظر

آلِ ماد کا عہدِ حکومت (جس کا ذکر "ثقافت" ماہ ستمبر میں آیا ہے) اگرچہ مختصر تھا لیکن تاریخ مشرق میں یہ پہلی قوم ابھری تھی جس نے مغربی ایشیا کے سامی آقاؤں کو پچھاڑ کر ایران میں ملکی حکومت قائم کی تھی۔

آلِ ماد کا اپنا تمدن تھا جس کی تفصیل کسی تاریخ سے معلوم نہیں ہو سکی۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کے بعد آنے والے پارسیوں نے آلِ ماد ہی کے تمدن کو اپنایا۔ بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ہخامنشیوں نے آلِ ماد ہی کے طور طریقے اختیار کیے، تو غلط نہ ہوگا۔

مذہب

آلِ ماد کے مذہب کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ لوگ مُغوں کے مذہب کی پیروی کرتے تھے۔ مُغوں کے قدیمی مذہب کا ابھی کچھ پتہ نہیں چلتا لیکن زردشت کے جو اقوال اوستا کے قدیم ترین حصے "گاتھا" میں درج ہیں، ان میں یہ کہا گیا ہے "میں نے جس مذہب کی دعوت دی ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ قدیمی مُغوں کے مذہب میں جو توہمات اور بدعات شامل ہو گئی ہیں، ان سے مذہب کو پاک کروں۔"[1] اس عبارت سے واضح ہو جاتا ہے کہ آلِ ماد مُغوں کے قدیمی مذہب کے پیرو تھے جس کی ترمیم شدہ صورت دینِ آتش پرستی ہے۔ شروع شروع میں آلِ ماد خدائے واحد کی پرستش کرتے تھے، جسے وہ آہورامزدا کہتے تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ان کے مذہب میں جادو اور

۱۔ عبداللہ رازی: تاریخ مفصل ایران، ص ۱۱

توہمات جگہ پاتے گئے۔ اور قسم قسم کی بدعتیں اس میں شامل ہوتی گئیں۔ زروشت اپنے مذہب مقدس کو انہی خرافات و توہمات سے پاک کرنے کا مقصد لے کر اٹھا تھا۔ زروشت کی یہ تجدید مذہب اہل وطن کو ناگوار گزری اور اسے آذربائیجان کو چھوڑ کر بلخ کا رخ کرنا پڑا۔

فنِ تعمیر

کہا جاتا ہے کہ آلِ ماد کے عہد میں معماری اور سنگ تراشی کا فن بہت نمایاں تھا لیکن اب اس کی کوئی یادگار باقی نہیں۔ اور جو آثار آل ماد سے متعلق سمجھے جاتے ہیں ان پر محققین میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ انہی میں ہمدان کے قریب ایک شیر کا مجسمہ ہے، جو اب ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ اور ایک مردہ خانہ بھی ہے جو کرمانشاہ کے قریب واقع ہے۔ اس پر آہورمزدا کی تمثیل کندہ ہے۔

آلِ ماد کے بانی دیوکس نے ہمدان میں قصرِ شاہی تعمیر کرایا تھا۔ جس کی بحوالہ ہیروڈوٹس سات دیواریں تھیں۔ ہر دیوار کا رنگ دوسرے سے مختلف تھا۔ بیرونی دیوار سفید رنگ کے پتھر کی تھی، دوسری سیاہ پتھر کی، تیسری کا رنگ گہرا سرخ، چوتھی کا آبی، پانچویں کا قرمزی، چھٹی کا روپہلی اور ساتویں کا رنگ سنہری تھا۔ یہ محل بابل کے فنِ تعمیر کے مطابق بنایا گیا تھا۔ اہل بابل اس محل کو سورج، چاند، سیاروں اور ستاروں کا مظہر سمجھتے تھے۔

زبان

آلِ ماد کے عہد کی ملکی زبان کیا تھی؟ یہ بھی وثوق سے کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس زبان میں کوئی کتبہ موجود نہیں۔ لیکن مشہور مستشرق ڈارمسٹیٹر نے یہ قیاس آرائی کی ہے کہ 'اوستا' آلِ ماد ہی کے زمانے میں لکھی گئی تھی۔ جرمن محقق نولدیکی لکھتا ہے کہ اگر شاہانِ آل ماد کا کوئی کتبہ دستیاب ہو سکتا تو میرا خیال ہے بلحاظ رسم الخط اور زبان یہ قدیم شاہانِ فارس کے کتبوں کی طرح ہوتا۔

۱۔ بحوالہ حسن پیرنیا: ایرانِ باستان، ج اول، ص ۲۲

ہخامنشی بادشاہوں کی مذہبی رواداری

ہخامنشی بادشاہوں کو جہاں کشورکشائی کی آرزو تھی، وہاں وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مفتوح اقوام کے مذہب کی حرمت برقرار رکھی جائے اور ان کے قدیمی تمدن کی شان و شوکت میں فرق نہ آنے پائے۔ کوروش اعظم نے ہمیشہ مفتوح اقوام کے دیوتاؤں اور معبدوں کا احترام کیا۔ اپنے فرمانوں میں جہاں کہیں معبدوں کا نام آیا بڑے احترام سے ان کا ذکر کیا بلکہ جس حکمران نے معبدوں کو تباہ کیا، انھیں از سرِ نو تعمیر کرایا۔

طرزِ حکومت

ہخامنشی عہد کے موسس کوروشِ اعظم (Cyrus the Great ۵۴۹ تا ۵۲۹ ق۔م) نے حکومت کو کامیاب بنانے کے لیے یہ طریق کار اختیار کیا کہ میڈیا، بابل، لیڈیا اور پارت (خراسان) میں اپنے والی مقرر کیے جو براہِ راست بادشاہ کو جواب دہ ہوتے تھے۔ بعد کے ہخامنشی بادشاہوں میں سے داریوشِ اعظم (Darius the Great ۵۲۱ تا ۴۸۵ ق۔م) نے اس خیال سے کہ اس طریقِ حکومت میں مختلف علاقوں کے والیوں کو بہت اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جس سے وہ خود مختاری کا دم بھرنے لگتے ہیں، مختلف ممالک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کر دیا۔ ہر صوبے کا حکمران "ساتراپ"[1] یا والی کہلاتا تھا۔ ہر صوبے میں والی کے علاوہ میر لشکر اور دبیر خصوصی (چیف سیکریٹری) بادشاہ ہی مقرر کرتا تھا۔ یہ سرکاری عہدے دار اپنے فرائض میں ایک دوسرے سے آزاد تھے، اور صوبے کے حالات سے براہِ راست مرکزی حکومت کو باخبر رکھتے تھے۔ اس صورت میں یہ تینوں حکام ایک دوسرے کے ہم نوا

۱۔ ساتراپ: داریوشِ اعظم نے جب ایران کی حکومت سنبھالی تو داور شیش کو بلخ کا حاکم بنایا۔ اس نے اپنے لیے شتراباوا کا لقب اختیار کیا۔ یونانی زبان میں یہ لفظ آیا تو ستراپس بن گیا۔ انگریزی میں یہی لفظ سیتراپ (Satrap) لکھا جانے لگا۔

R. W. Rogers: History of Ancient Persia, p. 104.

نہیں ہونے پاتے تھے۔ اس لیے بغاوت کا منصوبہ بننے کا امکان بھی بہت کم ہوتا تھا۔ مفتوحہ ممالک میں وقتاً فوقتاً نگران بھی بھیجے جاتے تھے جن کے ہمراہ فوجی دستے بھی ہوتے تھے۔ یہ نگران آزادانہ تحقیقات کرنے اور سزا دینے کے مجاز بھی تھے۔ والیوں یا دوسرے حکام کی ناقابل اعتراض روش سے بادشاہ کو آگاہ کرتے تھے۔ ان کے علاوہ خفیہ کام کرنے والے الگ منصدی بھی مامور کیے جاتے جو بادشاہ کو حالات کی اطلاع دیتے رہتے تھے۔

صوبوں کی تعداد جو بیس سے تیس تک تھی۔ یہ تعداد حالات کے مطابق گھٹتی بڑھتی بھی رہتی تھی۔ صوبوں میں مرکزی حیثیت میڈیا کو حاصل تھی۔ پارس دوسرے صوبوں سے ممتاز تھا کیونکہ یہ ہخامنشی خاندان کا گہوارہ تھا۔ اہل پارس ٹیکسوں سے مستثنٰی تھے۔ لیکن جب اس صوبے سے بادشاہ کا گزر ہوتا تو اہل پارس کو تحائف پیش کرنے پڑتے۔ ہر صوبے کے لیے جداگانہ ٹیکس تشخیص کیا جاتا تھا۔ اس ٹیکس کا کچھ حصہ نقدی کی صورت میں لیا جاتا اور کچھ اجناس کی صورت میں۔ سب سے زیادہ ٹیکس بابل پر عاید ہوتا۔ اس سے کم مصر پر اور سب سے کم مکران پر۔ والیوں کے اخراجات صوبوں کے ذمے ہوتے تھے۔ صوبوں کے والی عموماً شاہی خاندان کے افراد ہوتے تھے۔ شاہی خاندان کا کوئی فرد اس عہدے کے لیے موزوں نہ ہوتا تو بادشاہ کسی قابلِ اعتماد شخص کو مقرر کرکے اپنی بیٹی یا شاہی خاندان کی کسی لڑکی سے اس کی شادی کردیتا تاکہ قرابت داری کی وجہ سے والیٔ حکومت کی وفاداری میں فرق نہ آنے پائے۔

بادشاہ کے فرامین لے جانے اور جوابات لانے کے لیے ہرکارے مقرر تھے۔ جو تمام اہم راستوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ جن والیوں کے متعلق خبر ملتی کہ مرکزی حکومت کے خلاف شورش بپا کرنے کی فکر میں ہیں، انھیں فوراً معزول کردیا جاتا یا میرِ لشکر کے توسط سے مروا دیا جاتا۔

بادشاہ کا ذاتی محافظ دستہ تھا جو دو ہزار سواروں اور دو ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل تھا۔ بعد میں ان کی تعداد چار ہزار سے بڑھا کر دس ہزار کردی گئی۔ یہ فوج "سپاہ جاویدان" کہلاتی تھی۔ تمام

۱۔ R. W. Rogers: History of Ancient Persia, p. 113

اہم مراکز پر فوج متعین کردی جاتی تھی۔ سیاسی نظام[1] وہی تھا جو بابل اور میڈیا کے قدیم بادشاہوں کا تھا۔ البتہ کوروشِ اعظم اور داریوش اعظم نے اس نظام کو زیادہ مکمل اور پختہ بنا دیا۔"

نظامِ مواصلات

داریوش اعظم نے آمد و رفت میں آسانیاں پیدا کرنے کے لیے نظامِ مواصلات کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ اس کے حکم سے ایک طویل سڑک بنائی گئی جو سارد سے شوش تک جاتی تھی۔ یہ سڑک پندرہ سو میل لمبی تھی۔ اس کے علاوہ متعدد اور سڑکیں بھی بنائی گئیں جو مقبوضہ ممالک کے اہم مقامات کو ملاتی تھیں۔

داریوشِ اعظم کی خواہش تھی کہ مصر کو سلطنت کے باقی حصوں سے ملا دیا جائے۔ اس کا ذریعہ اس وقت ایک ہی تھا کہ نہر کے ذریعے دریائے نیل کو بحیرۂ احمر سے ملا دیا جاتا۔ چنانچہ ایک ماہر انجینئر سکیلاس یونانی کو جائزہ لینے پر مامور کیا گیا۔ جائزہ مکمل ہونے کے بعد داریوش کے حکم سے یہ نہر کھود دی گئی۔ اس نہر پر جگہ جگہ کتبے لگائے گئے جن کے بعض ٹکڑے دستیاب ہوئے ہیں۔ ایک پر یہ عبارت کندہ ہے "میں[2] ایرانی ہوں۔ ایران سے چل کر میں نے مصر فتح کیا۔ مصر میں بہنے والے نیل سے میں نے یہ نہر نکالنے کا حکم دیا کہ ایران کے ساحل سمندر سے اسے ملا دیا جائے۔ نہر کھود دی گئی۔ میرے حکم سے جہاز مصر سے چل کر ایران آتے تھے۔ بس یہی میرا مقصد تھا۔"

فنِ تعمیر میں داریوشِ اعظم کی دلچسپی

داریوش نہ صرف اپنے پیش رو ہخامنشی بادشاہوں سے ملکی فتوحات اور ملکی نظم و نسق میں آگے بڑھ گیا بلکہ عظیم عمارتیں تعمیر کرانے میں بھی سبقت لے گیا۔ سب سے بڑی عمارت جو داریوش نے بنوائی وہ پرسی پولس (اصطخر) کا شاہی محل تھا۔ اس کا ذکر بعد میں آئے گا۔

۱۔ آرتھر کرسٹن سین: تاریخ ایران بعہد ساسانیاں، ترجمہ اردو، ص ۷

۲۔ History of Ancient Persia, p 120, R. W. Rogers.

داریوش چاہتا تھا کہ اس کے کارنامے زندۂ جاوید ہوں۔ اس نے اپنے کارناموں کی مختصر سی روئداد بلند و بالا چوٹیوں پر کندہ کرائی۔ جہاں زمانے کے حادثات اثر انداز نہ ہو سکیں۔ اس غرض کے لیے اس طویل سلسلہ کوہ کی چوٹیاں منتخب کی گئیں جو کرمان شاہ کے میدان کے ساتھ ساتھ پھیلا ہوا ہے۔ یہ چوٹیاں اس سڑک کے کنارے پر ہیں جو تہران سے بغداد جانے والے کاروانوں کے لیے بنوائی گئی تھی۔

داریوش کے کتبوں میں تقریباً ہر بڑی بغاوت کو فرو کرنے، باغیوں کو سزا دینے اور نئی فتوحات حاصل کرنے کا ذکر ہے۔ ہر کتبہ آہورامزدا کی تعریف سے شروع ہوتا ہے۔

مالیات

صوبوں کے والیوں کے فرائض میں یہ بھی داخل تھا کہ اپنی ولایت سے مالیہ وصول کریں۔ وہ اپنے ذاتی اخراجات کے لیے بھی کچھ رقم کاشت کاروں سے وصول کرتے تھے۔ داریوش اعظم وہ پہلا ایرانی بادشاہ ہے جس نے اپنی مملکت میں سونے چاندی کے سکّے رائج کیے۔ اس زمانے کے سکّوں کے ایک طرف تیرانداز کی تشبیہ ہے۔ جس کا ایک گھٹنا زمین پر ہے اور ہاتھوں سے کمان کا چلّہ چڑھا رہا ہے۔

لشکر

مختلف علاقوں کے والیوں کا فرض تھا کہ وہ اپنی ولایتوں میں کسی قسم کی بدامنی نہ ہونے دیں۔ راستوں کو پُرامن اور محفوظ رکھیں تاکہ کاروان بلا روک ٹوک آجا سکیں۔ ملک کے اہم قلعوں کی حفاظت کے لیے مستقل طور پر فوج مقرر کی جاتی تھی۔ ہنگامی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مختلف اقوام اور قبائل سے لشکر جمع کیا جاتا تھا۔ لیکن یہ اس وقت ہوتا جب بادشاہ کسی خارجی حکمران کے خلاف لشکر کشی کرنا چاہتا۔

قانون

سلطنت کے قوانین خود بادشاہ امرائے سلطنت کے مشورے سے بناتا تھا۔ قانون جب بن جاتا تو وہ اٹل ہوتا تھا۔ بادشاہ اس کی سختی سے پابندی کرتا تھا۔ جرائم کی سزائیں بہت کڑی تھیں۔ قتل، زنا، بغاوت ایسے جرائم کی سزا قتل ہوتی تھی۔ سزا کے خوف سے کوئی شخص اپنے حقوق سے تجاوز نہیں

کرتا تھا۔

بادشاہ

قومی زندگی میں مرکزی حیثیت بادشاہ کی تھی۔ وہ مختارِ کل ہوتا تھا۔ اپنا قانون وہ کبھی بدلتا نہ تھا۔ ملک کی خوش حالی یا بدحالی کا انحصار بادشاہ کے دم سے تھا۔ کوئی منتظم، مدبّر اور طاقتور بادشاہ ہوا تو ملک خوش حال ہوگیا۔ نا اہل، عافیت پسند اور کمزور ہوا تو ملک کو تباہیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بادشاہ قومی اور ملکی روایات کی ہمیشہ پیروی کرتا تھا۔ اسے امورِ سلطنت میں امرا سے مشورہ بھی کرنا پڑتا تھا۔ بادشاہ جو ایک مرتبہ فیصلہ دے دیتا، اس سے منحرف نہ ہوتا تھا۔

عہدِ ہخامنشی میں فارس میں سات ممتاز خاندان تھے، جن کو خاص امتیازی حقوق حاصل تھے۔ ان خاندانوں کے سربراہوں کو امورِ سلطنت میں بھی عمل دخل ہوتا تھا۔ یہ جب چاہتے بادشاہ سے ملاقات کرسکتے تھے، سوائے اس وقت کے جب وہ حرم سرا کے اندر ہو۔ یہ امرا شہزادگان کہلاتے تھے۔ بادشاہ شادی کے لیے عموماً انہی امرا کے خاندانوں سے لڑکی انتخاب کرتا تھا۔ بادشاہ کی مجلسِ مشاورت بھی تھی، جو انہی امرا پر مشتمل ہوتی تھی۔

بادشاہ کا لباس اور وضع

بادشاہوں کے لباس کا اہم حصہ جبّہ ہوتا تھا جو پیچھے سے لٹکتا رہتا تھا۔ سر پر اونچی دیوار کا تاج ہوتا تھا۔ بادشاہ کانوں میں بالیاں پہنتے تھے۔ گلے میں طلائی ہار اور زنجیریں بھی ہوتی تھیں۔ کمر بند سونے کا ہوتا تھا۔ ڈاڑھی لمبی ہوتی تھی۔ بال عموماً گھنگریالے ہوتے تھے۔ شاہی عصا کے سرے پر سونے کا بنا ہوا سیب ہوتا تھا۔

ملکہ

ملکہ حرم میں مختارِ کل ہوتی تھی۔ سب کام اسی کی مرضی سے انجام پاتے تھے۔ بادشاہ کی دوسری بیگمات پر اس کی حکومت ہوتی تھی۔ اسے کثیر تعداد میں سالانہ مالیہ ملتا تھا۔ اس کا ذاتی عملہ بھی تھا۔ کوئی ملکہ ہوشیار ہوتی تو اس کا دربار پر بھی اثر ہوتا تھا۔ ملکہ مختار ہونے کے باوجود مادرِ ملکہ کے زیرِ اثر

ہوتی تھی۔ محل میں خواجہ سرا کام کرتے تھے۔ کوئی بادشاہ فضول خرچ اور عشرت پسند ہوتا تو خواجہ سراؤں کو من مانی کرنے کا موقع مل جاتا۔ اس صورت میں ان کا اثر بہت تباہ کن ہوتا۔ کبھی کبھی ان خواجہ سراؤں کا اثر و اقتدار اتنا زیادہ ہوتا کہ وہ بادشاہ گر بن جاتے۔

معاشرے میں عورتوں کا درجہ

ہخامنشی عہد میں ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کا رواج عام تھا۔ امرا کی عورتیں پردے میں رہتی تھیں۔ کہیں باہر نکلتیں تو عماریوں میں جن کے اردگرد پردے چھوڑ دیے جاتے۔ پردے کا یہاں تک اہتمام تھا کہ اس زمانے کے مجسموں میں یا ابھرواں تصویروں میں کسی عورت کی شبیہہ نظر نہیں آتی۔ لڑکیاں خونی رشتے کے مردوں سے بھی میل جول نہیں رکھ سکتی تھیں۔ شادی ان عورتوں سے بھی کرلی جاتی تھی جن سے اسلام کی رو سے شادی کرنا ناجائز ہے۔ امرا کے ہاں عورتوں کا کوئی کام کاج کرنا کسر شان سمجھا جاتا تھا۔ دیہاتی اور خانہ بدوش لوگوں کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں۔ ان کی زندگی امرا کی عورتوں کے لیے باعث رشک تھی۔

ایرانِ قدیم کی زبان

ایرانِ قدیم کی زبان کا پتہ صرف ان قدیمی کتبوں سے چلتا ہے جو چٹانوں پر کندہ کیے گئے تھے۔ اس عہد کی زبان کا کھوج لگانے میں مشہور مستشرقین گروٹ فنڈ، لاسن اور سر ہنری رالنسن نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ اس عہد کی زبان فارسی قدیم کہلاتی ہے جو ڈھائی ہزار سال کا طویل عرصہ گزرنے کے بعد آج بھی کتبوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ یہ وہ کتبے ہیں جو کورش اعظم اور داریوشِ اعظم کے حکم سے پہاڑوں پر کندہ کرائے گئے تھے۔ ان میں ایک بڑی یادگار "کتبہ بیستون" ہے جو داریوش نے کندہ کرایا تھا۔ بیستون وہی پہاڑ ہے جس کی وادی میں آج بھی فسانۂ فرہاد کی گونج سنائی دیتی ہے۔ یہ پہاڑ کرمان شاہ کے مشرق میں واقع ہے۔ اس کی چوٹی چار ہزار فٹ کی بلندی تک عموداً چلی گئی ہے۔ اور بھی کئی کتبے موجود ہیں جن میں نقشِ رستم، نقش رجب اور تخت جمشید کے کتبے خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں۔ داریوشِ اعظم کے کتبوں میں فتوحات کے تذکرے، بادشاہی فرامین اور کئی ملکی امور

سے متعلق تحریریں ہیں۔

ادبیات

ادبیات سے مراد فصیح نظم و نثر مراد ہے۔ اگرچہ یہ تعریف ان کتبوں پر صادق نہیں آتی لیکن ان کی زبان میں اتنا شکوہ ہے کہ انھیں فارسی ادب سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتبے قدیم ایرانی ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ ان کتبوں کے مطالعے کے بغیر قدیم فارسی کی تاریخ جاننا ممکن نہیں۔

رسم الخط

قدیم فارسی کا رسم الخط، خط میخی (Cuniform Script) کہلاتا ہے۔ خط میخی بابل و نینوا میں رائج تھا۔ ایرانیوں نے انہی کے ہاں سے یہ رسم الخط لے کر اپنایا اور اسے ترقی دی۔ ہخامنشی عہد کی تحریریں چٹانوں، سکّوں، برتنوں، ترازوؤں، نگینوں اور مختلف آلات پر ملتی ہیں۔ پروفیسر ای۔ جی براؤن، جرمنی کے مستشرق ڈارمیسٹیٹر کا حوالہ دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ان تحریروں کے مختلف الفاظ کی تعداد چار سو سے زیادہ نہیں۔

کتبوں کے مضامین

کتبوں کے مضامین قریب قریب ایک سے ہیں۔ ان میں یزدانِ پاک کی تعریف کے بعد بادشاہ کا نام اور اس کے حسب نسب اور فتوحات کا ذکر آتا ہے۔ جھوٹ اور ناپاکی کی مذمت اکثر کتبوں میں کی گئی ہے۔ بعض کتبوں میں حکومت کے طریق کار کا بھی ذکر ہے۔ یہ کتبے قدیم فارسی کے علاوہ آسوری اور عیلامی زبانوں میں بھی ہیں۔

مذہبی عقائد

ہخامنشی عہد کے لوگ خدا کی وحدانیت پر اعتقاد رکھتے تھے۔ آہورامزدا ان کے نزدیک خالق کائنات ہے۔ اپنے اقتدار اور حکمرانوں کو وہ آہورامزدا کی عنایت سمجھتے تھے۔ آہورامزدا کا تصوّر انسانی فہم سے بالا تھا اس لیے اس کی صفات کو سمجھنے سمجھانے کے لیے وہ آگ کو مظہر خداوندی

سمجھتے تھے اور اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس غرض کے لیے اہم مقامات پر آتش کدے بنائے گئے تھے۔ جن کے ساتھ اخراجات پورے کرنے کے لیے جاگیریں ملحق تھیں۔

داریوش دوم کے کتبوں میں پہلی مرتبہ مہر اور ناہید کا بھی ذکر ملتا ہے۔ اگرچہ قدیم ایرانی مہر کے معتقد تو تھے لیکن آفتاب کی پرستش پانچویں صدی ق۔م کے آخر میں شروع ہوئی۔ یہ لوگ آفتاب کی قسم کھاتے اور جنگ کے موقع پر آفتاب ہی سے مدد مانگتے تھے۔ اس زمانے میں اہل ایران آگ اور آفتاب کے علاوہ پانی، ہوا اور روشنی کو بھی مقدس سمجھتے تھے۔ قربانی کی رسم عام تھی۔ قربانی عموماً جانوروں کی دی جاتی تھی۔ جو کسی مُغ یعنی آتش پرستوں کے رہنما کی موجودگی میں ہوتی تھی۔

مُغ

مادوں کا ایک قبیلہ تھا جس کے سپرد مذہبی امور ہوتے تھے۔ اس قبیلے کے افراد مُغ کہلاتے تھے۔ ان کے عقاید قدیم آریہ قوم کے سے تھے۔ مُغوں اور پارسیوں کے عقاید میں فرق یہ تھا کہ مُغ اپنے مُردوں کو موم کا غلاف چڑھا کر زیر خاک دفن کر دیتے اور پارسی انھیں کسی بلند مقام پر رکھ کر انھیں پرندوں کی خوراک بننے کے لیے چھوڑ دیتے۔

آثار و صنائع

ہخامنشی بادشاہوں کو بڑی بڑی عمارتیں اور شاہی محلات تعمیر کرانے کا بہت شوق تھا۔ وہ مفتوحہ علاقوں کے لائق ترین معماروں اور استادانِ فن کو منگوا کر تعمیرات کے کام پر مامور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ایران کی قدیم عمارتوں میں مختلف اقوام کے فن تعمیر کا عکس جھلکتا ہے۔ "داریوش[1] کے کتبوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا محل بنانے میں بابل، ماد، لیڈیا اور مصر کے صنعت کاروں نے حصہ لیا تھا۔ اس میں جو مصالحہ استعمال ہوا وہ بھی مختلف ممالک سے منگوایا گیا تھا۔ مثلاً ہاتھی دانت ہندوستان سے، چوب سُندر لبنان سے، ستونوں کا پتھر یونان سے، اور دیواروں پر نقش و نگار کرنے کا ساز و سامان حبشہ سے

۱۔ عبداللہ رازی: تاریخ مفصل ایران، ص ۳۸

حاصل کیا گیا تھا۔ اس لیے قدیم ایران کی صنعت میں اگر مختلف ممالک کے فن تعمیر کا عکس ہے تو مقامِ تعجب نہیں"۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایرانِ قدیم کے صنعت کاروں کی اپنی صنعت کیا تھی اور اس فن میں ان کی ذاتی تخلیق کون سی تھی۔ مختلف ممالک کا فن تو جداگانہ ضرور تھا لیکن یہ ممالک ایرانی بادشاہوں کے تسلط میں تھے اور ایرانی مملکت کا جزو بن گئے تھے۔ اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اتنے مختلف تمدنوں کے ہوتے ہوئے فنِ صناعی میں کوئی وحدت نظر آتی۔ البتہ ایرانی فن کاروں نے مختلف قوموں کی صنعتوں کو ملا جلا کر اپنے ذوق و سلیقہ کے مطابق اسے نئی شکل میں پیش کیا۔ صنعتوں کے اس امتزاج سے ایک خصوصی صنعت وجود میں آ گئی۔ جو مختلف اقوام کی صنعتوں میں ممتاز ہو گئی۔

ایرانی معماروں کا یہ خصوصی طرزِ ہخامنشی تاجداروں کی خواہش کے مطابق ڈھل جاتا تھا۔ اس لیے کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا یہ فنِ تعمیر ایران ہی کا خصوصی فن تھا۔

آلِ ماد کے بادشاہ کیاکسارا (Cyaxares) کا محل جو ہمدان میں تعمیر ہوا اسی صنعت گری کا نمونہ تھا۔ پھر کوروشِ اعظم نے آلِ ماد کی حکومت ختم کر کے پازارگد کو دارالسلطنت بنایا تو اپنے لیے ایک عظیم محل تیار کرایا۔ جس کو جلانے کے لیے خود سکندرِ اعظم نے لوگوں کے ہاتھوں میں جلتی ہوئی مشعلیں دی تھیں اور دیوانہ وار رقص کرتے ہوئے انھوں نے اس قدیم یادگار کو جلا کر ڈھیر کر دیا تھا۔ اس کے ستون اب بھی سکندرِ اعظم کی دست بردگی یاد دلاتے ہیں۔

یہیں پہاڑ کی ایک چوٹی پر ایک ہموار مسطح مقام ہے، جسے آج کل "تختِ سلیمان" کہتے ہیں۔ اس کی شکل ایک متوازی الاضلاع کی سی ہے۔ اس کی لمبائی تین سو فٹ ہے۔ اس کی تعمیر میں سفید پتھروں کے بڑے بڑے ہموار ٹکڑے استعمال کیے گئے ہیں۔ یہاں کوئی سیڑھی دکھائی نہیں دیتی نہ کسی عمارت کے آثار ہی باقی ہیں۔

آگے بڑھیں تو یہاں کوروشِ اعظم کی شبیہہ کندہ ہے، جس کے بازوؤں کے ساتھ پر لگے ہیں۔ اسے دیکھ کر یہ بھی قیاس ہوتا ہے کہ اس تصویر کے ذریعے انسانی فہم و شعور کو مجسم کیا گیا ہے۔ یہاں

کبھی ایک کتبہ بھی تھا جس پر یہ عبارت کندہ تھی۔

"اے ابن آدم! میں کوروش ہوں، کمبوجیہ (Cambyses) کا فرزند، جس نے ایرانی حکومت کی تاسیس کی۔ میں ایشیا کا بادشاہ تھا۔ تمھیں میری اس یادگار پر حسد نہ ہونا چاہیے۔" یہ کتبہ اب تو موجود نہیں لیکن قدیم سیاحوں نے جو اس کی تصویریں لی تھیں وہ ضرور تاریخوں میں نظر آتی ہیں۔ کوروش کی شبیہہ اب کچھ فرسودہ ہوتی جا رہی ہے۔

کوروش اعظم کا مقبرہ مشہد مرغاب کے نزدیک واقع ہے۔ یہ پُروقار مقبرہ ایک چھوٹے سے کمرے پر مشتمل ہے، جو سفید پتھر کی چھ سیڑھیوں کے اوپر تعمیر کیا گیا ہے۔ مقبرے کی دیواریں پتھر کے بڑے بڑے ٹکڑوں سے بنائی گئی ہیں۔ دروازہ اس کا بہت تنگ ہے۔ اس میں انسان جھک کر بہ مشکل داخل ہو سکتا ہے۔ اندر کا حصہ دس فٹ پانچ انچ لمبا اور سات فٹ چھ انچ چوڑا ہے۔ اونچائی اس کی چھ فٹ دس انچ ہے۔ اس مقبرے کو اہل ایران بہت طویل عرصے تک "مسجد مادر سلیمان" سمجھتے رہے۔

اصطخر کے شاہی محلات

اصطخر جسے یونانی پرسی پولس کہتے ہیں، مرودشت کے زرخیز میدان میں واقع ہے۔ یہ پازارگد سے چالیس میل کے فاصلے پر ہے۔ ان کے مابین ایک سلسلۂ کوہ حائل ہے۔ اسطخر ہخامنشیوں کا دارالحکومت تھا۔ یہاں ان کی قدیمی عظمت کے نشان نمایاں ہیں۔ سلسلہ کوہ میں ایک مسطح میدان ہے جو تخت جمشید کے نام سے موسوم ہے۔ یہ مقام ہموار سطح سے چالیس فٹ اونچائی پر ہے۔ لمبائی اس کی پندرہ سو تئیس فٹ اور چوڑائی نو سو بیس فٹ ہے۔ یہ بھی "تخت سلیمان" کی طرح سفید پتھر کے ہموار ٹکڑوں سے تعمیر کیا گیا ہے۔ اس کی وسعت اور صنعت گری کو دیکھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ اس

۱۔ سر پرسی سائیکس: ہسٹری آف پرشیا، ج اول، ص ۱۸۰

سطح پر پہنچنے کے لیے متعدد سیڑھیوں پر سے چڑھنا پڑتا ہے۔ میدان پر پہنچتے ہی داریوش اعظم کے بیٹے خشایارشا کا ایوان نظر پڑتا ہے۔ اس ایوان پر پردار بیلوں کی ابھرواں تصویریں ہیں۔ اوپر تین زبانوں یعنی قدیم فارسی، آسوری اور عیلامی میں کتبے کندہ ہیں۔ جن کا مضمون یہ ہے " میں خشایارشا ہوں، بادشاہ اعظم، بادشاہوں کا بادشاہ، مختلف زبانیں بولنے والے ملکوں کا بادشاہ، اس عظیم مملکت کا بادشاہ، فرزند داریوش، آہورامزدا کی تائید سے میں نے یہ ایوان بنایا ہے۔"

یہاں تمام مفتوحہ ممالک کے بادشاہوں کی تصویریں کندہ ہیں۔ وسطی ایوان کے چار ستونوں میں سے صرف دو باقی رہ گئے ہیں۔ ان ستونوں کے اوپر کے سرے انسانی چہروں سے مشابہ ہیں۔ ان کی گھنی ڈاڑھیاں اب بھی نظر آتی ہیں۔ یہ ایوان محل میں داخل ہونے کا راستہ تھا۔ آگے بڑھیں تو اور بھی سیڑھیاں ہیں۔ سیڑھیوں کی دیواروں کے اندر اور باہر بہت سی ابھرواں تصویریں ہیں۔ سیڑھیوں کی بڑی دیوار کی اونچائی بارہ فٹ ہے۔ اس پر ابھرواں تصویروں کی تین قطاریں ہیں۔ بائیں طرف کی تصویر میں گھوڑوں سمیت رتھ دکھائے گئے ہیں جن میں مسلح سپاہی سوار ہیں۔ دائیں طرف کی ابھرواں تصویروں کے پس منظر میں سرو کندہ ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ مختلف زبانیں بولنے والی اقوام کے نمائندوں کی تصویریں ہیں۔ جو بادشاہ کے لیے تحائف اٹھائے چلے آرہے ہیں۔

اس سیڑھی پر چڑھ کر ایسے مقام پر آتے ہیں جو کبھی خشایارشا کا ایوان خاص تھا۔ اس ایوان کے بہتر ستون تھے۔ اب ان ستونوں میں سے صرف بارہ ستون کھڑے ہیں جو محل کی عظمتِ رفتہ کا نشان ہیں۔

داریوش اعظم کا محل نسبتاً چھوٹا تھا۔ اس کے اب صرف چند ستون باقی ہیں۔ یہ محل بھی سکندر کے ہاتھوں جلایا گیا تھا۔

تخت جمشید کے عقب میں تین دخمے (مردہ خانے) ہیں۔ ان سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے

پر ایک مقام نقش رستم کے نام سے موسوم ہے۔ یہاں چار قدیمی مقبرے ہیں۔ جو پہاڑ کے پہلوؤں میں شگاف کر کے بنائے گئے ہیں۔ انہی میں داریوش کا مقبرہ ہے۔ اس مقبرے پر کوئی کتبہ تو نہیں البتہ مقبرے کے باہر ایک ایوان موجود ہے جس میں اٹھائیس افراد کی تصویریں کندہ کی گئی ہیں۔ یہ تصویریں غالباً ان والیوں کی ہیں جن کو داریوش اعظم نے مختلف ولایتوں کی حکومت دی تھی۔ ایک تصویر داریوش کی ہے جو بائیں ہاتھ سے کمان پر ٹیک لگائے ہے اور دایاں ہاتھ اس کا آتش کدہ کی طرف دراز ہے۔

بعض مقامات پر چہار گوشہ آتش کدے نظر آتے ہیں جو پہاڑ کی چوٹیوں کو تراش کر بنائے گئے تھے۔ ان آتش کدوں میں آگ جلا کر پرستش کی جاتی تھی۔ نقش رستم میں ایک مقبرے کے دائیں طرف بھی دو آتش کدے ہیں۔ پازارگد میں مقبرہ کوروش کے قریب دو آتش کدوں کے پائے اب تک نظر آتے ہیں جو مکعب پتھر کے ٹکڑوں کے بنائے گئے ہیں۔ آج کل یہ جگہ تخت طاؤس کے نام سے موسوم ہے۔

انڈونیشیا

مصنفہ شاہد حسین رزاقی

جمہوریہ انڈونیشیا کا مکمل خاکہ جس میں تاریخی تسلسل کے ساتھ اس ملک کے حالات اور اہم واقعات قلمبند کیے گئے ہیں۔ اور دینی، سیاسی، معاشی و ثقافتی تحریکوں، تعلیمی اداروں، سیاسی جماعتوں قومی اتحاد و استحکام کی جدوجہد نئے دور کے مسائل اور تعمیر و ترقی کے امکانات جیسے تمام اہم پہلوؤں پر اس انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے کہ انڈونیشیا کے ماضی و حال اور مستقبل کا نہایت واضح نقشہ نظروں کے سامنے آجاتا ہے۔ قیمت قسم اول ۹ روپے، قسم دوم ۷ روپے

ملنے کا پتہ: سیکریٹری ادارۂ ثقافت اسلامیہ، کلب روڈ، لاہور